غلام باغ ......مرکزی کرداروں کے داخلی بحران

ڈاکٹر سفیر حیدر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

"Ghulam Bagh" by Mirza Ather Baig, is a representative urdu novel of 21st century. This novel has deep philosophical and psychological debates. It is very much visible that the chief characters of this novel have some internal problems. This article shows the reasons of their internal crisis.

مرزا اطہر بیگ نے اُردو ناول کو اکیسویں صدی میں جس اعتماد سے داخل کیا، اس سے اُردو ناول کے مستقبل پر سوالیہ نشان معدوم ہو گیا ہے۔ امجد طفیل کے الفاظ میں ''جو لوگ آج کے دور کو تخلیقی بنجر پن سے موسوم کرتے ہیں' اُن کو ''غلام باغ'' کی شکل میں شافعی جواب مل گیا ہے۔''[۱] اور عبداللہ حسین جیسے رجحان ساز ناول نگار نے ''غلام باغ'' کو اُردو ناول کی روایت سے قطعی منفرد قرار دیا ہے اور ان کے نزدیک ''اس کے ڈانڈے یورپی ناول، خاص طور پر فرانسیسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں۔''[۲]

ناول کے تفصیلی تجزیہ سے پہلے بالترتیب مرتضٰی رضوی اور ڈاکٹر انوار احمد کی آراء کو دیکھنا ضروری ہے تاکہ اس ضخیم ناول میں موجود کثیر الجہت مباحث کے واضح اشاروں تک رسائی ممکن ہو سکے۔

> "The novel revolves round uselessness of human condition born out of borrowed intellectualism .It throws up a post-existentialism debate in a society not equiped with its own intellectual tools and thus unable to document and analyze its unique predicament ____It is an attempt at capturing the inner choas that sinners underneath a seemingly composed facade of everyday life."[۳]
>
> "MIrza Ather Baig's narrative adresses the everlasting questions and conflicts between life and death,being and nothingness, meaningfulness and absurdity and allied issues human beings have always faced and adressed."[۴]

''غلام باغ'' کے انسان کو غلامی اور آزادی کی ازلی جدلیات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں ''انسان غلبے کی نفسیات میں لتھڑا ہوا ہے غالب آنے کی جبلت کی مختلف سطحیں، پرتیں اور لب و لہجے نظر آتے ہیں۔ تہذیبی سے لے کر انفرادی

سطح تک غلبے کی خواہش کا پھیلاؤ ہے۔ کرداروں کے اندر دوسروں کی آزادی سلب کرنے کی تمنا ابھرابھر کر سامنے آتی ہے۔ یاورعطائی ہو' نواب ثریا جا' یا ہوس پرست ٹولہ' ہر کوئی مغلوب شکاری کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ مغلوب کردار افلاس زدہ معاشرہ ہو، مددعلی یا ہاف مین ہو یا عورت بھی ہو سکتے ہیں۔ ارزل نسلوں کی اساطیر جو کہ ایک فرضی کتاب ہے اس میں سامراجی اورنو سامراجی تھیم بھی غلبے کی اسی لہر کا شاخسانہ ہے۔ اسی طرح یہاں انعام گڑھ کا بھی ذکر ہے، جو یاورعطائی کا اصلی مقام ہے اور چودھریوں اور یاورعطائی کے تعلق میں بھی طاقتور طبقے کے خلاف کمزور کا ردِعمل موجود ہے اور یہاں اساطیر دراصل جدید سے آن ملتی ہیں۔ پھرآگے یہ سلسلہ پاوراور کالیا تک پہنچتا ہے۔ بھگدڑ میں مرنے والے بلکہ کچلے جانے والے یہ کردار بھی سیاسی جبر کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ سیاسی غلبے کی یہ تصویریں اندوہناک ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے انسان کے ارزل نسلوں سے لے کر بھگدڑ تک کے زمانی تسلسل میں ایک مکمل تعلق موجود ہے۔ پھراس ناول کے انسان پر جنسی جذبے کا غلبہ بھی ہے۔ یہاں صاحبِ اختیارلوگ پاورعطائی کے آگے بے بس ہیں۔

''غلام باغ'' کے مضطرب انسان ایک سرئیلی کیفیت میں کبھی زمان ومکان سے ماورا، ان دیکھی، پرخطر سمتوں میں تخیلی سفر پہ نکل پڑتے ہیں اور کبھی بیٹھے بیٹھے کسی ناموجود خلا کی نظر ہو جاتے ہیں لیکن ''غلام باغ'' ایسا انتشار ہے جو ایک منظّم ذہن کی گرفت میں ہے۔ یہاں ہذیان بھی بامعنی ہے اور لایعنیت کی گود میں کہانی پلتی بڑھتی جاتی ہے۔

''لایعنی، ادھورے فقروں کی بیت بازی''
اچانک کبیر نے کہا۔
''جسے لکھا نہیں جا سکتا۔'' زہرہ نے کہا۔
''میں لکھنے کی نہیں۔ دوبارہ لکھنے کی بات کرتا ہوں۔''
کبیر نے تاریک لہجے میں کہا۔
''کرو'' زہرہ
'' لکھنے میں ہی' دوبارہ لکھنے کی تباہی کے بیج دفن رہتے ہیں۔'' کبیر
''کھودنکالنے والوں کے لیے''۔کبیر
''کیسی مٹی میں؟'' زہرہ
''مٹی جس میں تاریخ کی کرسیاں میزیں منجمد ہوتی ہیں۔'' کبیر
''کیسے'' زہرہ
''انہونی کی باقیات'' کبیر۔
''جیسے'' زہرہ
''جیسے تیز ہوا کی شام'' کبیر
''وہ سب کچھ جو اور بھی ہے'' زہرہ
''وہ سب کچھ جو ہوسکتا ہے'' کبیر

''وہ سب کچھ جو نہیں ہوسکتا'' زہرہ
''وہ سب کچھ جو لکھا جا سکتا ہے'' کبیر
''وہ سب کچھ جو نہیں لکھا جا سکتا ہے'' زہرہ
''وہ سب کچھ جو بولا جا سکتا ہے'' کبیر
''وہ سب کچھ جو نہیں بولا جا سکتا'' زہرہ
''وہ سب کچھ جو سنا جا سکتا ہے'' کبیر
''وہ سب کچھ جو نہیں سنا جا سکتا'' زہرہ
''اس سب کچھ کو جینے کی ضرورت ہے'' کبیر
''اس سب کچھ کو دوبارہ جینے کی ضرورت ہے'' زہرہ
''دوبارہ لکھو'' کبیر
''دوبارہ بولو'' زہرہ
''دوبارہ سنو'' کبیر
''دوبارہ جیو'' زہرہ
''دوبارہ جیو'' کبیر۵

''غلام باغ'' میں لالکھائی کے تصور کے ذریعے انسان کے داخلی وجود کی ان پرتوں کو سامنے لایا گیا ہے جو عموماً زیرِ بحث نہیں آتیں۔ بظاہر اسے نثری عشق کے طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن معاملہ ''کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے'' کے مترادف ہے۔ لالکھائی ایک مابعد الطبعیاتی سطح ہے کہ ان کہی، لکھے گئے اور کہے گئے کے نیچے موجود ہے لہٰذہ لالکھائی کی طرف جانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا باقاعدہ لکھت کی جانب متوجہ ہونا اہم ہے یہاں قاری کا دیدار کی 'Theory of Deconsturction' کی طرف دھیان جانا لازم ہے۔ ہستی اور نیستی کا ازلی تصادم لکھائی اور لالکھائی کی صورت میں ایک نئی ساخت میں موجود ہے۔ تخلیقی عمل کی جستجو بھی نمایاں ہے کہ یہاں کوئی لفظ لکھے بغیر بھی مصنف ہوسکتا ہے۔ کوئی تصویر بنائے بغیر بھی مصور کہلا سکتا ہے اور کسی دھن کو ترتیب دیئے بغیر بھی موسیقار ہونا ممکن ہے یعنی تخلیقی زندگی کی وسعت انسانی زندگی میں بے پایاں ہے۔ یہی لالکھائی کا پیغام ہے۔

''غلام باغ'' کا پوسٹ کولونیل انسان جس دائرے میں مقید ہے۔ وہاں اپنی ماں بولی تو دُور کی بات ہے اپنی نباتات تک ختم ہو جاتی ہیں اور نام نہاد آزادی یا آزاد غلامی اپنی نباتات تک سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہے اور آقاؤں کر سرزمین کے پودے تک درآمد کر کے فخر محسوس کرتی ہے کیوں کہ اس کے پس منظر میں ایسے واقعات بھی نہیں کہ جب غلام باغ میں آقاؤں کی زبان بولنے پر سزائے موت تک ٹل سکتی ہے۔

''مستعفی ماسٹر نے رحیم چوہدری کو اس کے گھر کے سامنے چھُریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اُسے پھانسی کی سزا ہوئی مگر پھر اپیل پر بڑے انگریز جج نے جب ملزم سے انگریزی کے کچھ صحیح گرامر کے فقرے سنے تو

خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی اس نے پھانسی کی سزا کو کالے پانی کی سزا میں بدل دیا۔''۶؎

غلام باغ کے اندر مرکزی کرداروں کا اضطراب ازلی آزادی پسند انسان کی غلامی کی دیدہ و نادیدہ صورتوں سے اظہارِ تنفر کی علامت ہے۔ اس طرح ''غلام باغ'' مزاحمت کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ ایڈورڈ سعید کے خیال میں ناول دوقسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو استعمار کے کھلے دوست ہیں اور ایک وہ جو استعمار کے کھلے دشمن۔ خود کو اٹوٹ زنجیروں میں جکڑے ہوئے پا کر حیرت و اضطراب پر یونان کے نمائندہ شاعر کوافی کی یہ نظم ''غلام باغ'' کے انسان کو حیرت اور اضطراب کی تفہیم میں کلیدی نسخہ ثابت ہوسکتی ہے۔

"With no consideration,no pity ,no shame.They have built walls around me. And now I sit here feeling hopless. I can't think of any thing else: this fate gnaws my mind, because I have so much to do outside.When they were building the walls,how could I not have noticed! But I never heared the builders, not a sound Imperceptibly they have closed me off from the outside world.۷؎

مرزا اطہر بیگ نے ارزل نسلوں نے نام لکھے گئے اس ناول میں ارزل نسلوں کے انسانوں کی محدود استطاعت کی حامل تقدیر کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ انسان کے لیے غلام باغ کی متنوع جہتیں ہیں۔ ایک فرد کی ذات سے لے کر پوری کائنات تک غلام باغ کا پھیلاؤ ممکن ہے۔ اس پھیلے ہوئے غلام باغ کے پرندوں کا اضطراب دیدنی ہے۔ یہاں انسان اپنی قید کو کوئی معنی ،کوئی نام دینا چاہتا ہے اور یوں یہ قیدی پرندے پھڑ پھڑاتے ہیں، نادیدہ و دیدہ دیواروں سے سرٹکراتے ہیں، خالی آسمان کو گھورتے ہیں، کسی مدفون خزانے کی تلاش میں اپنے اپنے وجود کی بنجر زمین کو کریدتے ہیں۔ کوئی اپنی ارزل نسلوں کے جینیاتی مسائل کے غلام باغ میں ہے۔ کوئی نو آبادیاتی نظام کی غذا بن رہا ہے، کچھ لوگ لذتِ وجود کے غلام باغ میں کھو کھلے جسموں کی گرتی دیواروں کو سہارا دینے کی سعی رائیگاں میں مبتلا ہیں۔ ہر کردار اپنے اپنے مقدر کے بھاری پتھر کو پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتا ہے لیکن سرِ شام سسی فس کی نامراد تھکن یاس خیز بانہیں پھیلائے اس کی منتظر ہوتی ہے۔ یہ ایسے کردار ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا شفا ان کی تقدیر ہی میں نہ تھی لیکن زیریں سطح پر یہ خیال بھی سر اٹھاتا ہے کہ شاید مقدر بھی دوا بھی نہیں کی گئی۔ غلام باغ کے نمائندہ ترین کردار کبیر کا اضطراب قلبِ انسانی کی بےقراری کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اس کی اڑان میں تو نہیں لیکن اڑان کے ارادے میں بڑا تحرک ہے۔ یہ کردار آج کے نوجوانوں کی بنجر سائیکی کا منظر نامہ ہے غلام باغ کے باقی کردار کسی ظاہری حادثے، رشتے، خواہش، کمزوری یا وراثتی عنصر کے سبب متاثر ہیں لیکن کبیر وہ کردار ہے جو اپنے اندر سے برباد ہے جیسا کہ سارتر نے ژینے کے متعلق کہا تھا کہ اس نے اپنا مقدر خود ناکامی اور بربادی سے عبارت کیا تھا۔ کبیر روشن کینوس پر تاریکی کی تصویریں بناتا ہے۔ بےثمر مسافت کی تھکن سے جو اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے، اس اکتاہٹ نے اسے بیمار کر دیا ہے۔ وہ کتابوں کے صحرا میں لفظوں کی ریت پھانک رہا ہے اور ''اصل کام'' دُوری کے ناقابلِ علاج احساسِ محرومی میں مبتلا ہے کیونکہ اس کے نزدیک ''لفظ انسان کو آزاد کرتا ہے، جو شخص اپنا اظہار نہیں کرسکتا، وہ دراصل غلام ہے، بولنا آزادی کا عمل ہے بلکہ خود آزادی ہے۔''۸؎

یہاں مرزا اطہر بیگ نے انسان کی آزادی کو اظہار سے مشروط قرار دیا ہے لیکن کبیر کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ لفظ کے ذریعے آزادی کا تمنائی ہے لیکن الفاظ جو خود غلام باغ بن بیٹھے ہیں۔ اس کی ہذیان نویسی زبان کے غلام باغ کی فصیل میں شگاف ڈالنے کی کوشش ہے۔ وہ پیسے لے کر سطحی لفظ بیچتا ہے یوں اس کی سائیکی ایک ایسی عورت کے مجرم ضمیر کی حامل ہے جو جسم بیچنے کے عمل کو غلاظت سمجھتی ہو لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہ اپنائے، بلکہ راستہ بدلنے کا حوصلہ بھی نہ ہو۔ ہمہ وقت ایک مجہول ارادے کی ضد میں رہے اور اس کی ایسی، گیدڑ، جھکیاں، جو دوسروں سے زیادہ اس کی اپنی ذات کے لیے ہیں سنائی دیتی نہیں کہ ایک وقت آئے گا جب میں کبیر کے نام سے لکھوں گا جب میرا اصل کام سامنے آئے گا تو کبیر مہدی کے نام سے ہی ہو گا۔''۹ لیکن وہ یہ بات بھول جاتا ہے اور بارِ دگر بھول جاتا ہے کہ غلام باغ کے باسی انسان کو سزا جرم سے پہلے ملتی ہے۔ یہاں سوچنا نہیں، بولنا نہیں، ارادہ نہیں باندھنا (کیونکہ نقلی اور نام نہاد انسانی معاشرت میں اصلی کام کا کیا کام؟) ڈھونڈنا نہیں، تخلیق نہیں، تحقیق نہیں، متحرک نہیں ہونا، کیونکہ غلامی نام ہے جمود کا۔ بالآخر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کبیر مہدی جو لفظ کے ذریعے آزادی کے متمنی تھا کچھ اس طرح بچایا بچایا گیا کہ وہ دُنیا کے سب کام کر سکتا تھا سوائے لکھنے کے۔ غلام باغ میں نواب ثریا جاہ جبر کے تسلسل کا استعارہ ہے۔ استعمار کو کسی شکل میں بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کو کچلنا اس استحصالی نظام کے نمائندہ کردار کا اولین فرض ہے۔ اس کے الفاظ کی بازگشت دیر تک گونجتی رہتی ہے۔

> ''سنو گورے چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈنے والوں کی سزا موت ہے۔ خواہ وہ زمین کھودنے والے ہوں یا علم کھودنے والے' انہیں مجھے دوبارہ جلانا پڑے گا۔''۱۰

کبیر کے کئی روپ ہیں، خود پسند، باتونی، نظریہ باز، گیگلا، گہرا، کھوکھلا، دیوانہ، ہوشیار، بہت کمزور، بہت مضبوط۔ دراصل کبیر جدید آدمی کے وجود کے منقسم حصوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ بقول زہرہ، ''یہ شخص کسی بھی لمحے کے عذاب کو توڑ پھوڑ کر رکھ سکتا ہے۔'' یوں کبیر جب اپنے اضطراب کو اپنے کلام اور عمل کا حصہ بناتا ہے تو وہ ان انسانوں کی سدا بہار علامت بن جاتا ہے جو ہر دور میں معاشرے کے مروجہ نظامِ حیات کے آگے سوالیہ نشان کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ایسے کردار معروف معنی میں نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے کے لیے بھی 'خطرناک' ہوتے ہیں۔ کبیر بھی بڑا 'خطرناک' کردار ہے۔ ہاف مین کے لیے، نجم الثاقب کے لیے، ناصر کے لیے، زہرہ کے لیے اور خود اپنے لیے۔ قاری بھی اس کے مضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح ناول میں وہ راکھ ہوتا ہے اور ققنس کی صورت اپنی راکھ سے نیا جنم لیتا ہے اور جلانے والوں کو اسے بارِ دگر جلانا پڑتا ہے۔ کبیر کے موت کا تجربہ اس ناول کے قاری کے لیے ایک اکلوتے انسان کی موت کا تجربہ نہیں بلکہ ایسا انسانی المیہ ہے جو استحصالی قوتوں کے سامنے سوال اٹھانے والوں کی شکست و ریخت سے عبارت ہے۔ کبیر کی موت کا تجربہ مصنف کی کمالِ فن سے قاری کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے اور یوں ناول ختم کرنا آسان ہے کبیر کا ختم کرنا مشکل ہے۔ وہ ایسا انسان ہے جو اپنی زندگی میں ہر لمحہ اپنی سیماب صفتی کی وجہ سے اپنے اور دوسروں کے لیے جنون آمیز کردار کی صورت میں زندہ رہتا ہے اور اپنی موت کے بعد سوال بن کر غلام باغ کی فضاؤں میں تحلیل نہیں ہوتا بلکہ ایک مستقل بازگشت بن جاتا ہے۔

> ''کبیر چوپی زاویوں کے اس خلفشار سے ایک لمحے کے لیے بھی نظریں ہٹائے بغیر ہنسا۔ ''نہیں یہ وہ کبیر نہیں ہے۔ یہ لنگڑا کبیر ہے جو فنا فی النار ہونے کے بعد اپنا جلا ہوا چھلکا اتار کر تاریخ کا دوبارہ نظارہ کرنے

نکلا ہے۔'' اس نے کہا اور اپنے مخصوص نظریہ بازی کے انداز میں بولا۔ ''میں آج کی تاریخ کا نظریہ دوں گا اور زمین میں خوفناک بے ترتیبی سے گڑی ہوئی ان کرسیوں میں سے کسی ایک پر بیٹھ کر دوں گا اور لازم ہے کہ میرے دوسرے میرے بالمقابل نشست کریں اور انتشار میں اپنا اپنا مقام حاصل کریں۔'' ۱۱

''جو کچھ کہا گیا۔ اس کہی کی ان کہی کو کہنے کا وقت آ گیا ہے۔'' کبیر نے اعلان کیا۔ ''کہی کی ان کہی وہ ممنوعہ کلام ہے جو ظاہری کلام کے پیچھے ہر لمحہ ہمارے اندر چھپا رہتا ہے۔ یہ خالصتاً اندر کی بک بک ہے۔ اسے جُوں کا تُوں باہر لانا ہے تو دیوانگی کو گلے لگانا ہوگا۔ عقل و خرد صرف ظاہر کے رہنما ہیں خطرہ، بہت زیادہ ہے۔ دیکھ لو......شاید کل دُنیا یہ سُنے کہ کچھ لوگ باتیں کرتے کرتے پاگل ہو گئے۔'' ۱۲

''پتہ نہیں میں کیا ہوں؟ کبھی، شاید، جب کبھی میں نے اپنا اصل کام مکمل کر لیا تو پھر میں بتا سکوں گا میں کیا ہوں......'' ۱۳

کبیر کردار کے حوالے سے رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول ''سنجوگ'' کی ابتداء میں دیے گئے یہ جملے بہت معنی خیز ہیں۔

''قیدی نے جواب دیا: میں نے ان زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے۔ میں شب و روز انہیں گھڑتا رہا اور جب یہ اٹوٹ ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ میں ان میں جکڑا ہوا ہوں۔'' ۱۴

کبیر ناکامی کے تفہیم کا تسلسل ہے۔ بے رحم حقیقت نگاری کا پیغمبر۔ وہ مغربی علمی، ثقافتی، تہذیبی غلبہ سے اکتاہٹ کا شکار ہے۔ کبیر کی کتابو کے ذریعے مغرب کے غلبے کو علامتی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ کبیر سمجھتا ہے کہ وہ کتابیں اس پر حملہ آور ہیں لیکن وہ افسرِ بالا کی زبان میں ایسا انقلابی ہے جو بڑا مقصد نہیں رکھتا۔ خیر اس بات میں اتنی صداقت ہے کہ بڑے مقصد کی تکمیل کا راستہ نہیں پا سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ مغربی غلبے کو نہ ہضم کر سکتے ہیں اور نہ گریز ممکن ہے۔ لہٰذا وہ تیسرا راستہ اختیار کرتا ہے تمسخر کا راستہ۔ لیکن کبیر کی ناکامی یہی ہے کہ مغربی علم کے حوالے سے وہ تمسخر سے نکل نہیں پاتا۔ ''دوبارہ لکھو'' میں اسے محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب وہ اصل کام تک پہنچ گیا ہے لیکن دوبارہ لکھنا بھی محال ہو جاتا ہے اور نامرادی ملتی ہے۔

کبیر کی دوسری ناکامی یہ ہے کہ زبان کے ساتھ کھیلنے کے باوجود زبان اس کے قابو میں نہیں آتی۔ کبیر ہمیشہ یہ کھوجنے کی کوشش کرتا ہے کہ فکشن کیا ہے؟ نیلا رجسٹر اسی سوال کی تلاش ہے لیکن وہ کسی طور کامیاب نہیں ہو پاتا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا اصل کام ادھورا ہے اور جب وہ زہرہ کو نیلا رجسٹر دیتا ہے تو دراصل وہ اپنے عمل کا تسلسل چاہتا ہے۔

''غلام باغ'' کے کردار ہاف مین کے ذریعے مرزا اطہر بیگ نے ان انسانوں کے نمائندہ کرداروں کا ایک نمونہ پیش کیا ہے جو استعماری طاقتوں کے باشندے ہوتے ہیں لیکن ان کے اندر کی روشنی انہیں خالص سچ کی متلاشی بنا دیتی ہے اور یوں وہ ارزل قوموں کے ساتھ اپنا ذاتی قلبی رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ ہاف میں کی محبوبہ اسے طعنہ بھی دیتی ہے کہ ''ڈارلنگ تم سے کبھی کبھی مجھے مقامیوں کی بُو آتی ہے۔'' آخر اس کا انجام بھی مقامیوں جیسا ہوتا ہے کیونکہ غلام باغ 'Base facts' تک رسائی کی جسارت کی سزا موت کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ ہاف مین کے کردار سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ پورا انسان بننے کے لیے نسلی، علاقائی، قومیت کے مفادات، تاریخ کے یک طرفہ جھکاؤ سے ماوراء ہونا پڑتا ہے چاہے اس غیر جانبداری کے نتیجے میں انسان کو کھنڈرات کے ملبے کا جزو بننا پڑے۔ ہاف

مین (اگر ہم آدھا آدمی کہیں) تو کھنڈر کھودتے کھودتے خود کھنڈر بنا دیا گیا لیکن یہ کھنڈر ہونا اسے پورا آدمی بنا گیا۔ اس طرح ''جنم کھنڈر'' جیسی Paradoxical ترکیب کی پرتیں بھی کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ مرکزی کردار کبیر کے الفاظ میں ہاف مین کی انسانی عظمت کو یاں سراہا جاتا ہے۔

> ''اسے گہرائیوں سے عشق تھا، مدفون دُنیائیں ڈھونڈنے والا، بھدی سطحیں دُور ہٹانے والا، اگر ایک روز اپنے اسی جنون کے ساتھ خود بھی ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے......تو کیا یہ ایک شاندار انجام نہیں......آخر دفن ہونا سب کا مقدر ہے۔''۱۵

مرزا اطہر بیگ نے ''غلام باغ'' میں زہرہ کے کردار کے ذریعے عورت کے کئی روپ دریافت کیے ہیں۔ ایک بات تو یہ ملتی ہے کہ عورت اپنے وجود کا اثبات مرد کے غلبے کے بغیر چاہتی ہے۔ زہرہ کے کردار کی دوسری جہت یہ ہے کہ انسان اپنے وجود کے اسرار کو سمجھنے کے لیے اپنی وراثت میں اپنی جڑوں تک پہنچنا چاہتا ہے اس سفر میں اس کو کئی قسم کے انکشافات کی اذیت ناکیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ زہرہ انسانی دل کے اندر تجسس کے ناقابلِ دباؤ لاوے کی علامت ہے۔ کبیر اگر مجسم اضطراب ہے تو زہرہ سرتاپا تجسس۔ ہاف مین اور کبیر کی ٹریجڈی موت سے جنم لیتی ہے تو زہرہ کی زندگی ہی ٹریجڈی ہے۔ اس کا وجودی بحران اس کے لیے لحہ لحہ موت کا سامان کرتا ہے۔ ہاف مین زیرِ زمین گم ہوتا ہے اور کبیر بارِ دگر نذرِ آتش۔ لیکن زہرہ اپنے وجود کے ملبے تلے دبی لڑکی ہے۔ وہ دستِ تہ سنگ کی صورت بے بس ہے لیکن پسپائی سے انکار اس کی سرشت میں شامل ہے۔ زہرہ اپنی جڑوں میں جانے کا معاملہ جب کبیر کے ساتھ زیرِ بحث لاتی ہے تو کبیر اس بات کو ہوا دیتا ہے کہ وہاں ضرور چلیں گے۔ جب وہ حقیقتاً وہاں جاتے ہیں تو وہ دیکھتی ہے کہ بس یہی اصل تھی۔ ''اینٹی کلائمکس'' ہے کہ شاید اصل بھی کچھ نہیں لیکن وہاں سے واقعات کا سلسلہ چلتا ہے یعنی بچی کا زخمی ہونا، پتلا بنا کر لانا۔ یہاں اساطیری سطح شروع ہوتی ہے لیکن اساطیر اور حقیقت کا امتزاج سامنے آتا ہے جس کی بنیاد زہرہ کا تجسس تھا اور پھر بیانیہ قدیم ترین انسانوں کے زندہ رہنے کے عمل میں اتر جاتا ہے۔ وہ اپنی نامرادی کے سرچشمے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور یہ بات تو ہزاروں سال پہلے طے ہو چکی ہے کہ:

"The people, who search the reason of things,they bring serious upon them."

زہرہ کی بحثیں، زندہ دلی، قہقہے، توانائی، خاندان سے محاذ آرائی اور کبیر، ناصر اور ہاف مین کے درمیان اپنی ذات کی سرحد بندی کا خیال، خود کو ثابت کرنے کی شدید کوششوں کا ایک سلسلہ ہے۔ خصوصاً کبیر کے ساتھ اس کے رشتے کی کثیر الجہتی بہت معنی خیز ہے۔ کبیر کے لیے وہ فنا بھی ہو سکتی ہے لیکن جسم کی سطح پر آگ میں کود جانے والی، روح کی سطح پر سجدے سے گریزاں بھی ہے۔ یہاں زہرہ اس انسان کی علامت ہے جو ہر حال میں اپنی ذات کی شناخت اپنے ہونے کی بنیاد پر چاہتا ہے۔ اپنی ذات کو خود مکتفی گواہی سمجھتا ہے۔ اس وجودی تصورِ انسان کو مرزا اطہر بیگ نے اپنے فلسفی ہونے کے پس منظر کے باعث بڑے جاندار طریقے سے پیش کیا ہے۔ زہرہ ہر بار اک نیا قدم اٹھاتی ہے اور سوچتی ہے کہ ''میں ہوں'' لیکن ساری فضا اس کے وجود کی نفی کی چادر میں لپیٹ دیتی ہے۔ اس کا دم گھٹتا ہے۔ یہاں وہ اس انسانی خواہش کا بھی استعارہ ہے کہ نابود سے پہلے بود کے مرحلے سے تو گزر جائے۔ فرد اور معاشرے کے تصادم میں عموماً ایسے انسانوں کو اپنے وجود کے اثبات سے محروم ہی رکھا جاتا ہے۔ زہرہ کے کردار کے حوالے سے محمد حسن عسکری کا وہ بے مثل جملہ بہت معنی خیز ہے جو انہوں نے عزیز

احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کے مرکزی کردار نور جہاں کے حوالے سے تحریر کیا تھا کہ ''اس کے المیہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔'' زہرہ کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے کہ بے بس نیند میں مصیبت زدہ خواب دیکھنا اس کا مقدر ہے۔ وہ ملکہ سبا ضرور ہے مگر خلا میں معلق اجڑے ہوئے شہرِ ذات کی ہے جو اپنی جڑوں کی بازیافت اپنی یادداشت میں بھی نہیں کرسکتی۔ وہ کسی ٹھوس زمین پر قدم رکھنے سے قاصر ہے بقول ڈاکٹر ناصر ''اس کا جنون دوسرا ہے، وہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کے باپ یاور عطائی کا معمہ کیا ہے؟'' ۱۶

> ''وہ زہرہ تھی جو تیز برستی بارش، زناٹے دار ہوا اور اولوں کی بوچھاڑ میں گھومتی پھرتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے سر کو پیچھے جھٹک کر جو اس کے مخصوص عادت تھی، اپنا چہرہ آسمان کی طرف اُٹھا دیتی تھی اور منہ کھول دیتی تھی، جیسے دھواں دھار برستی بارش کو سیدھا پی جانا چاہتی ہو۔ ''میرے خدا کیا یہ پاگل لڑکی ہے۔'' عارفہ بیگم نے سوچا۔'' ۱۷

کبیر اور ہذیانی مکالمے جہاں واقعات کے ہذیان کو اپنے اظہار کے بطن میں سمیٹے ہوئے ہیں وہاں ان دونوں کے رشتے کی داخلی دیوانگی کے عکاس بھی بنتے ہیں۔ ایسی دیوانگی جو فرزانگی کی حدوں کو چھو رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زبان پر اختیار ختم ہو گیا ہے اور وہ قابو سے باہر ہو رہی ہے یہاں دراصل انسانی رشتوں کی ناممکنات کی جستجو تیز تر صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ کھُڈے کے اندر جہاں بابے کو لے کر بیٹھے ہیں وہاں بھی کبیر اور زہرہ کو کلام کی شناخت ختم کر کے ناممکن یکجائی کی حالت میں دکھایا گیا ہے۔ وہاں یہ سمجھ نہیں آتی کہ کبیر بول رہا ہے یا زہرہ۔ یہ حقیقی سطح پر کاملاً ممکن نہ ہو لیکن انتہائی مابعدالطبیعاتی سطح پر رشتے کی اس سطح کو دریافت کیا گیا ہے۔

کبیر اور زہرہ کی صورت میں ایسے انسانی رشتے کی تلاش ہے جو عورت اور مرد دونوں کو اپنی جگہ پر آزاد رکھتے ہوئے بھرپور طور پر موجود ہو۔ یہ عملی سطح پر شاید ممکن نہیں۔ اسے محض عورت مرد کے مثالی رشتے کی تلاش ہے۔ کبیر اور زہرہ کا رشتہ دوستی اور محبت کا بھی ہے اور یہ دو آزادیوں کا تصادم بھی ہے۔ زہرہ کے دوسرے مردوں، ناصر، ہاف مین وغیرہ سے بھی تعلقات ہیں یہاں بلاشرکت غیر ایک مرد سے رشتہ کی بھی زیریں سطح پر کہیں کہیں نفی ہوتی نظر آتی ہے۔ شدید عشق کے دائرے میں موجود عورت مرد بھی دوسروں کے لیے کہیں کہیں گنجائش رکھتے ہیں۔ اگرچہ کبیر کے لیے وہ فنا کے تجربے سے گذرنے میں بھی ایک لمحے کو متامّل نظر نہیں آتی اور بے خطر جلتے ہوئے ''گھونسلے'' یا بیت القفس میں کود پڑتی ہے یا کبیر کی موت کے بعد ساری رات جل پتھری کے نیچے لپٹی رہتی ہے۔ اس کا گریہ بھی اس کے عشق کی طرح اور اس کے محبوب کی طرح منفرد تھا۔

> ''زہرہ سیدھی لمبی رات کی طرف قدم اٹھاتی چٹان کے نیچے جھُکی اور اس نے اپنا جسم پتھر پر لمبا پھیلا دیا۔ پھر جل پتھری کا قطرہ اس کے ماتھے کے بیچ گرا اور ٹوٹ کر اس کی دونوں آنکھوں کی طرف ڈھلک گیا...... ڈھاک کے درختوں کے جھنڈ میں سے پتھریلی مٹی کی درزوں سے اور شاید روشن ستاروں سے۔ ایک آہٹ کی طرح۔ ایک چاپ کی طرح۔ رات گزرتی تھی اور جل پتھری کے قطرے مسلسل اس کے ماتھے پر گرتے تھے اور اس کی آنکھوں کو دھو ڈالتے تھے۔ سورج نکلا اور ایک جادوئی صبح اس مقام

پر روشن ہوگئی۔ زہرہ چٹان کے نیچے سے باہر آئی تو کسی موتی کی طرح اجلی تھی۔ اس کی دھلی ہوئی آنکھیں شفاف اور روشن تھیں۔''۱۸؎

''غلام باغ میں ننگے افلاطون کی کردار سازی کے پس منظر میں مرزا اطہر بیگ نے انسان کے فطرت کے اس پہلو کو واضح کیا ہے کہ ایک گروہ بعض اوقات اوہام کے اندھیروں میں رہنے میں عافیت سمجھتا ہے۔حقیقت اور وہم کی آمیزش سے بُنا یہ کردار نہ صرف قدیم فلسفوں کی بعض موشگافیوں پر طنز ہے اور ان علوم کو ننگا کر کے رکھ دیتا ہے جو آج تک ارزل نسلوں کی تقدیر کے اندھیروں میں ذرہ برابر کمی بھی نہیں کر سکے۔ دوسری طرف زوالِ انسان کی اس وجہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ حقیت تک رسائی پانے کی کوشش کرنے والوں کو جلا دیا جاتا ہے یا دفنا دیا جاتا ہے لیکن اس معاشرے میں جب وہی کبیر ننگے افلاطون کا متبادل دیتا ہے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔ گویا اندھیروں کے سفر پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ سُولی پر وہی لٹکے گا جو تیسری دُنیا یا پسماندہ طبقے یا ارزل نسلوں کو روشنی کا خواب دکھائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ننگے افلاطون کی کردار سازی، مذہبی اوہام پرستی پر متلائی ہوئی کیفیت میں شدید طنز بھی ہے اور کہیں پس پردہ یہ احساس بھی ہے کہ جنہیں اپنی ذات کے اندھیروں میں گم رہنے کا بہت زیادہ شوق ہے انہیں خواہ مخواہ روشنی کی خبر دے کر مضطرب کرنے سے کیا حاصل؟ اس سے بہتر سے بچاری روحوں کو دیوتا فراہم کرتے رہو خواہ وہ ننگے افلاطون ہوں یا گونگے مدعلی۔

افلاطون کے نام کو استعمال کیا گیا ہے جو مغرب کی ایک بڑی علمی علامت ہے۔ بظاہر مصنف ننگے افلاطون کو سیدھی نثر میں اس طرح لکھنا چاہتا ہے جیسے کوئی لسانی مشق ہو لیکن اس کی بنیاد میں غدر اور مغرب کا حوالہ بھی ہے۔ ننگا افلاطون کی پیش کش ایک پیچیدہ صورتحال کی مظہر ہے اس میں مغرب، جنس، توہم پرستی، عقیدت، معجزے کے ساتھ عقیدت کا عنصر وغیرہ گڈ مڈ ہیں۔ کبیر کے اندر ایک جنونی کیفیت ابھرتی ہے کہ اُسے قتل کر دے یہاں کبیر کے لاشعور میں مغرب کی نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔

''مدعلی چپ سادھ لیتا لے'' کہ باب میں انسان کے وجود میں خاموشی اور گویائی کے جدلیاتی رشتے کو سامنے لایا گیا ہے۔ وہ وجد کی حالت میں اس چُپ کی سطح سے نکلتا ہے یعنی موسیقی اور رقص اس کو زبان سے ماوراء لے جاتے ہیں۔

''غلام باغ'' کے انسان کے لیے نروان کا لمحہ جہاں نئی زندگی کا داعی ہے وہاں موت کا لمحہ بھی ہے۔ یہاں اپنے اپنے نروان کی بھینٹ چڑھنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ نروان کے لمحوں میں کسی کی قوتِ گویائی مرتی ہے تو کسی کی ذات تحلیل ہوجاتی ہے۔''غلام باغ'' کا نروان آتش زیر پا کی صورت اپنے باسیوں کی تقدیروں کے تلوے جلا کر رکھ دیتا ہے۔ پارو اور کالیا کو غلام باغ کی حدود اور معاشرتی جکڑ بندیوں کو توڑنے اور ارزل نسلوں کے مقدر کے دائرے کو عبور کر کے ایک دوسرے کو پا لینے کی جسارت کی سزا یوں ملتی ہے کہ ان کے روندے ہوئے خوابوں کی انتڑیاں تک کُچلی جاتی ہے۔

''میں نے اس مرد اور عورت کی آنکھوں میں جو وحشت دیکھی وہ ایک تاریک آگ جیسی تھی جیسے سیاہی دہک رہی ہو۔ مرد کچھ آگے تھا اور عورت پیچھے۔ اس نے گھوم کر عورت کی طرف دیکھا اور اسی لمحے ایک پولیس والے نے عورت کے سر پر لاٹھی سے زور دار ضرب لگائی وہ تیورا کر نیچے گرنے ہی والی تھی کہ مرد نے سُرعت سے گھوم کر اسے اپنے بازو کے گھیرے میں تھام لیا۔مگر اس وقت لاٹھی کی دوسری ضرب اس کے سر

پر لگی اور وہ دونوں نیچے گر گئے۔ اس لمحے میں نے دیکھا کہ اُن کے بازو ایک دوسرے کی گرد ہیں اور چہرے آسمان کی طرف ہیں۔ میں بس ایک لمحے کیلئے انہیں اُن کے پاس روپ میں دیکھ سکا، جس میں ان کی ماؤں نے انہیں جنا تھا...... میری نظریں بھگدڑ کے اس نقطے پر جمی تھیں جہاں وہ مرد اور عورت گرے تھے۔ میں نے دیکھا کہ چند ہی لمحوں میں اُن کے پیٹ کچلتے قدموں کی ضربوں سے پھٹ گئے۔'' ۱۹

مجموعی طور پر ہم دیکھیں تو مرزا اطہر بیگ کا انسان ''غلام باغ'' کی جکڑ بندیوں میں پھڑ پھڑا رہا ہے۔ یہ انسان ایسے غلام باغ میں ہے جہاں اپنے خواب کی انگلی پکڑ کر چلنے والوں کو زندہ جلایا، دفنایا یا کچل دیا جاتا ہے۔ یہاں سوچنا جرم ہے اور سزا پاگل پن ہے۔ انسان کے لیے یہ دُنیا کا غلام باغ انہونی سی عبارت ہے۔ اس غلام باغ میں خوابوں کے پرستار انسان منہ کے بل گرتے ہیں اور ان کے ہاتھ رات کی دلدل کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ایسے میں انسان کے اندر اس غلام باغ سے فرار کی خواہش ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ غلام باغ اس قدر پراسرار ہے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک زمان و مکان کی بربادی کے طلسم کو توڑ سکتی ہے۔ اس انسانی غلام باغ میں گفتگو ہی نہیں واقعات کا بھی ہذیان ہے۔ یہاں پنجرے پرندوں کی تلاش میں ہیں۔ اس غلام باغ (زندگی) میں ان گنت دروازے ہیں جو شیطانی تاریک ذہنوں کے فرش پر کھلتے ہیں اور ان سے آگے شگاف ہی شگاف ہیں۔ کسی ایک بھی غیر محتاط قدم کا بہانہ کافی ہے اور ڈراؤنا گہرا گڑھا ناگزیر تقدیر بن کر گود لے لیتا ہے۔

انسانوں کے مقدر کے اس غلام باغ میں وقت کا تصور معدوم ہے۔ یہاں زندگی بے شمار خوفناک راتوں سے عبارت ہے۔ یہاں نشان زدہ کو بلڈوز کر دیا جاتا ہے۔

غلام باغ میں سیاسی حوالہ بھرپور طور پر موجود ہے اور انسانی زندگی کو سیاسی غلبے کے تسلسل میں دکھایا گیا ہے۔ ارزل نسلوں سے لے کر بھگدڑ تک ایک پورا تعلق موجود ہے۔

غلام باغ کی کئی جہات ہیں ضخیم ناول کے داخلی تانے بانے میں انسان کو مختلف حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک تو فرد کی دوسرے فرد یا افراد پر غلبے کی تمنا ہے۔ کرداروں کے اندر غلاب آنے کی خواہش کا وفور دیدنی ہے۔ دوسرے کی آزادی سلب کرنے کے لیے ہر کوئی بے قرار ہے۔

ہر بستی، ہر ثقافت، ہر علاقے اور ہر خطے کے لوگوں کا انسانی شعور ان کے اپنے جینیاتی تسلسل، ماحول، غربت، امارت، اَن پڑھ جہالت یا پڑھی لکھی جہالت کے تحت پرورش پاتا ہے۔ مانگر جاتی کے لوگ زہرہ اور کبیر کو حیرت زدہ وہ کر دیکھتے ہیں تو وہاں یہ دلچسپ جملے ملتے ہیں۔ جو وہ بچی کی زخمی کلائی کی مرہم پٹی کروانا چاہتے ہیں اور دونوں اس بستی کے لوگوں کے لیے ناشناسائی کی دھول میں بھی اٹے ہوئے ہیں۔

''مکمل بے یقینی سے کچھ انسانی یقین کی سطح پر ہم آئے ہیں۔ اس تشویشناک حادثے کی وجہ سے۔ ہاں اب شاید یہ ذلتوں کے مارے لوگ ہمیں پتھر لکڑی کی بجائے انسان سمجھنے ہیں۔ میں نے کہا۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ ہنوز ہم مانگر جاتی کے تصورِ انسان سے نابلد ہیں۔'' ۲۰

حواشی:

۱۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: امجد طفیل، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۲۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: عبداللہ حسین، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۳۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: مرتضیٰ رضوی، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۴۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: ڈاکٹر انوار احمد، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۵۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۳۷۷ تا ۳۹۷

۶۔ ایضاً، ص: ۶۷

۷۔ یونانی شاعر کوافی کی نظم

۸۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: امجد طفیل، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۹۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۱۴۰

۱۰۔ ایضاً، ص: ۶۲۸

۱۱۔ ایضاً، ص: ۶۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص: ۳۵۵

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ ٹیگور، رابندر ناتھ، سنجوگ، مترجم: رضا مظہری، نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی، س۔ن

۱۵۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، فلیپ: امجد طفیل، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۶۴۶

۱۶۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، لاہور: سانجھ، اشاعت سوم، ۲۰۱۲ء، ص: ۲۲۶

۱۷۔ ایضاً، ص: ۲۲۸

۱۸۔ ایضاً، ص: ۸۷۳

۱۹۔ ایضاً، ص: ۷۹۸

۲۰۔ ایضاً، ص: ۷۸۱۔۷۸۲